سعادت حسن منٹو

سیاہ حاشیے

سیاہ حاشئے

سعادت حسن منٹو

مکتبۂ شعر و ادب لاہور
۷، ڈی بلاک سمن آباد

سیاہ حاشئے

اُس آدمی کے نام

جس نے اپنی خونریزیوں کا ذکر کرتے
ہوئے کہا۔

"جب میں نے ایک بڑھیا کو مارا تو
مجھے ایسا لگا مجھ سے قتل ہو گیا ہے"۔

جملہ حقوق بحق صفیہ منٹو محفوظ ہیں۔

ناشر ———— محمد نواز
مکتبۂ شعر و ادب لاہور

طابع ———— ندرت پرنٹرز۔ لاہور

قیمت :- ۵/- روپے

کتابت ———— علاؤالدین سلیمی

حاشیہ آرائی

پچھلے دس سال میں نئے ادب کی تحریک نے اردو افسانوی ادب میں گرانقدر اضافے کئے ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر و بیشتر نئے افسانوں کی محرک تخلیق کی اندرونی لگن نہیں تھی بلکہ خارجی حالات اور واقعات، خواہ ان کا تعلق خود مصنف کی ذات سے ہو یا ماحول سے۔ ممکن ہے یہ بہت حد تک اس رائج الوقت عقیدے کے ماتحت ہوا ہو کہ محض خارجی ماحول کو بدل دینے سے انسانوں کی داخلی زندگی کو بدلا جا سکتا ہے۔ بہرحال عام طور سے یہ دستور رہا ہے کہ جب ہمارے افسانے نگاروں کو اپنی ادبی سرگرمیاں کمزور ہوتی معلوم ہوئی ہیں تو انہوں نے اپنے آپ کو الزام نہیں دیا، انہیں کبھی یہ تشویش نہیں ہوئی کہ شاید ہماری اندرونی نشو و نما بند ہو گئی ہے جسے ہم داخلی عمل سے دوبارہ جاری کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف انہوں نے اپنے آپ کو یہی سوچ کے تسلی دے لی کہ خارجی دنیا میں کوئی ایسی بات ہو ہی نہیں

رہی جس کے بارے میں لکھا جائے۔ چھ سات سال ہوئے میں نے اردو کے ایک افسانہ نگار کو جنہوں نے مفلسی، غلامی اور کشمیر کے متعلق افسانے لکھ کر خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ اگر جاپانی ہندوستان پر حملہ کر دیں اور ملک میں کچھ گڑبڑ ہو تو ادب پہ بہار آئے۔

خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، جاپانیوں کا نہ سہی قحط کا حملہ ہوا۔ کسی نے چور بازار میں چاول بیچ کر روپے بٹورے کسی نے افسانے لکھ کر شہرت، چلئے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے کسی نہ کسی کے بھلے کے لئے ہی ہوتا ہے، اس زمانے میں قحط کے موضوع کو ایسا تقدس حاصل ہوا کہ طالب علموں تک نے اپنے جنسی تجربات کے بجائے بھوکوں کے متعلق لکھنا شروع کر دیا، زور یہ تھا کہ اگر رسالے کے مدیر نے افسانہ چھاپنے سے انکار کر دیا تو وہ شقی القلب اور بے رحم ٹھہرے گا غرض بنگال کی مصیبتوں کے طفیل ہمارے افسانہ نگاروں کو کچھ دن خاصی آسانی رہی، گھڑے گھڑائے افسانے ملتے رہے، واقعات، جذبات سب مہیا تھے کسی چیز کے لئے کاوش کی ضرورت ہی نہ تھی۔

پھر قحط کچھ ٹھنڈا پڑا تو جہازیوں کی ہڑتال ہو گئی، کہیں فتح کے جشن میں ہنگامہ ہو گیا، غرض کسی نہ کسی طرح کاروبار چلتا رہا۔ اور جب ۴۷ء کے فسادات ہوئے تو گویا اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کے دیا۔ جی چاہے تو المیہ افسانہ لکھئے، ورنہ طنزیہ مضمون ہو سکتا ہے، انسانوں کی درندگی پر دانت پیسئے، سامراج کی چالاکیوں کا پردہ چاک کیجئے، ان باتوں سے جی بھر جائے تو کچھ عورتوں کی بے حرمتی کے ذکر سے گرمی پیدا کیجئے۔ موقع موقع سے یہ بھی دکھاتے چلئے کہ اس بہیمیت کے ساتھ ساتھ ہمدلی

اور انسانی ہمدردی کے نمونے بھی ملتے ہیں، پھر بھولا سا منہ بنا کر تعجب کیجئے کہ ہندو مسلمانوں کی عقل کو کیا ہو گیا، کل تک تو بھائی بھائی تھے، آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے۔ بس خطرہ یہ رہ جاتا ہے کہ کہیں آپ کے اوپر جانب داری کا الزام نہ آ جائے تو وہ بھی ایسی مشکل بات نہیں، شروع میں اگر پانچ ہندو مارے گئے تو افسانہ ختم ہوتے ہوتے پانچ مسلمانوں کا حساب پورا ہو جانا چاہیئے ــــ ترازو کی تول دونوں طرف قصور برابر کر دیجئے۔ رمزِ اصل میں یہ ہے کہ آپ اپنی انسانیت پرستی، نیک دلی، بے تعصبی اور امن پسندی ثابت کر دیں، اور کسی کو بات بری بھی نہ لگے۔

اگر کوئی آدمی ہوا میں تنی ہوئی رسّی پہ چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو داد تو ہمیں اس کو بھی دینی چاہیئے، آخر اپنے شریفانہ جذبات کو منظرِ عام پہ لانا اور اس طرح دوسروں کے شریفانہ جذبات کو مشتعل کرنا بھی تو انسانیت کی ایک خدمت ہے۔ البتہ شریفانہ جذبات میں تھوڑی سی کسر یہ ہے کہ ان کے ذریعے ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی، ہیں یہ بات کوئی خیالی اور غیر ممکن العمل معیار سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں، فسادات والا ادب اپنے اوپر جو شرائط عائد کرتا ہے انہیں عموماً خود پورا نہیں کرتا۔ فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگار سب سے پہلا دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم سچ بولیں گے، مگر ساتھ ہی انہیں یہ بھی فکر ہوتی ہے کہ نہ ہندو ناراض ہوں نہ مسلمان، غیر جانب داری کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت سے زیادہ قصور وار نہ ٹھہرایا جائے۔ یہ ادب ظلم، سنگدلی اور بہیمیت کو مطعون کرنا چاہتا ہے۔ مگر ظلم کو ظلم کہنے کی طاقت نہیں رکھتا اس ذمے داری سے بچنا چاہتا ہے۔ ادب سے ہم اس قسم کے سچ جھوٹ کا مطالبہ نہیں کرتے جو ہم تاریخ یا معاشیات یا سیاسیات کی کتابوں سے کرتے ہیں۔ ادب سے

ہم کسی نظریے یا خارجی دنیا کے بارے میں سچ بولنے کا اتنا مطالبہ نہیں کرتے جتنا اپنے بارے میں سچ بولنے کا۔ فسادات پر لکھنے والے چاہے دنیا بھر کے بارے میں سچ بولتے ہوں، لیکن اپنے بارے میں نہیں بولتے۔ ان کی سب سے بڑی کاوش یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے فطری میلانات اور تعصبات کو چھپائے رکھیں۔ حالانکہ اتنی زبردست شورش کے زمانے میں ایسے تعصبات کا ابھر آنا حیاتیاتی ضرورت ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے افسانوں میں واقعی کوئی انسانی معنویت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں اپنی انسانی کمزوری کا اعتراف کرنا ہوگا۔ اپنے اندر جو سچ جھوٹ بھرا ہوا ہے اس سے چشم پوشی کر کے سچا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مقبولِ عام ادب پیدا ہو سکتا ہے، کیونکہ پڑھنے والے بھی تو اپنے آپ کو یہی یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ ہمارے شریفانہ جذبات مرے نہیں۔ دراصل ادب کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون ظلم کر رہا ہے۔ کون نہیں کر رہا، ظلم ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ ادب تو دیکھتا ہے کہ ظلم کرتے ہوئے اور ظلم سہتے ہوئے انسانوں کا خارجی اور داخلی رویہ کیا ہوتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، ظلم کا خارجی عمل اور اس کے خارجی لوازمات بے معنی چیزیں ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار ظلم کے صرف معاشرتی پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ظالم اور مظلوم کی اندرونی زندگی سے ظلم کو کیا تعلق ہے۔ اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے افسانہ نگار تلواریں اور بندوقیں تو بیسیوں دکھاتے ہیں۔ کاش ان تلواروں اور بندوقوں کے پیچھے جیتے جاگتے ہاتھ اور سامنے جیتے جاگتے سینے بھی ہوتے!۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فسادات پر لکھنے والے سرے سے بے خلوص ہیں، ان میں سے بعض لوگ واقعی نیک دل اور نیک نیت ہیں، مگر

ادب میں عام زندگی والا خلوص کام نہیں دیتا۔ یہ لوگ اس مقصد سے افسانے لکھتے ہیں کہ ظلم کا خارجی عمل دکھا کر ظلم کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کریں لیکن جب تک ہمیں کسی فعل کا انسانی پس منظر معلوم نہ ہو۔ محض خارجی عمل کا نظارہ ہمارے اندر کوئی دیرپا، ٹھوس اور گہری معنویت رکھنے والا ردِّ عمل پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم انسانوں سے تو نفرت اور محبت کر سکتے ہیں "ظالموں" اور "مظلوموں" سے نہیں۔

فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے ظلم سے نفرت دلانے کے لئے اکثر یہ طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ کہ ظلم ہوتا ہوا دکھا کر پڑھنے والوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی جائے، مگر یہ سارے واقعات اتنے تازہ ہیں، لوگ اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں یا اپنے قریبی دوستوں سے اتنا کچھ سن چکے ہیں۔ کہ محض ظلموں کی فہرست اب ان کے اوپر کوئی اثر ہی نہیں کرتی۔ اگر آپ نے اپنے افسانے میں دو چار عورتوں کی بے حرمتی یا بچوں کا قتل دکھا دیا تو اس سے لوگوں کے اعصاب پر کوئی ردعمل ہوتا ہی نہیں، یہ زمانہ ہی ایسا غیر معمولی ہے کہ غیر معمولی ظلم آج کل بے انتہا معمولی چیز بن گئے ہیں، غیر معمولی باتیں اب لوگوں کو چونکاتی ہی نہیں، اس قسم کے ذکر سے ان کا تجسّس تک بیدار نہیں ہوتا اخلاقی حِس تو دور کی چیز ہے۔ فسادات والے افسانے ادب نہیں تھے تو نہ ہوتے مگر وہ تو اپنا سماجی مقصد بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو باتیں یہ افسانے پیش کرتے ہیں۔ وہ تو اب خبریں بھی نہیں رہیں۔

منٹو نے بھی فسادات کے متعلق کچھ لکھا ہے، یعنی یہ لطیفے یا چھوٹے چھوٹے افسانے جمع کئے ہیں۔ دراصل میں نے بڑا غلط فقرہ استعمال کیا ہے۔

یہ افسانے فسادات کے متعلق نہیں ہیں، بلکہ انسانوں کے بارے میں، منٹو کے افسانوں میں آپ انسانوں کو مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے ہیں۔ انسان بحیثیت طوائف کے، انسان بحیثیت تماش بین کے، وغیرہ وغیرہ۔ ان افسانوں میں آپ انسان ہی دیکھیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور فسادات کے مخصوص حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا۔ اگر تلقین سے آدمی سدھر جایا کرتے تو مسٹر گاندھی کی جان ہی کیوں جاتی، منٹو کو افسانوں کے اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط فہمیاں ہیں نہ انہوں نے ایسی ذمے داری اپنے سر لی ہے جو ادب پوری کر ہی نہیں سکتا۔ سچ پوچھئے تو منٹو نے ظلم پر بھی کوئی خاص زور نہیں دیا، انہوں نے چند واقعات تو ضرور ہوتے دکھائے ہیں، مگر یہ کہیں نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ واقعات یا افعال بنفسہ اچھے ہیں یا برے، نہ انہوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں۔ انہوں نے تو یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں۔ برِ اعظم ہندوستان کے یہ فسادات ایسی پیچیدہ چیز ہیں، اور صدیوں کی تاریخ سے، صدیوں آگے کے مستقبل سے اس بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق یوں آسانی سے اچھے برے کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، کم سے کم ایک معقول ادیب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایسے ہوش اڑا دینے والے واقعات کے متعلق سیاسی لوگوں کی سطح پر اُتر کے فیصلے کرنے لگے، منٹو نے اپنے افسانوں میں وہی کیا ہے جو ایک ایماندار (سیاسی معنوں میں ایماندار نہیں بلکہ ادیب کی حیثیت سے ایماندار) اور حقیقی ادیب کو ان حالات میں اور

ایسے واقعات کے اتنے تھوڑے عرصے بعد لکھتے ہوئے کرنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے نیک و بد کے سوال ہی کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر نہ سیاسی ہے، نہ عمرانی، نہ اخلاقی، بلکہ ادبی اور تخلیقی۔ منٹو نے تو صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ظالم یا مظلوم کی شخصیت کے مختلف تقاضوں سے ظالمانہ فعل کا کیا تعلق ہے۔ ظلم کرنے کی خواہش کے علاوہ ظالم کے اندر اور کون کون سے میلانات کارفرما ہیں، انسانی دماغ میں ظلم کتنی جگہ گھیرتا ہے، زندگی کی دوسری دلچسپیاں باقی رہتی ہیں یا نہیں۔ منٹو نے نہ تو رحم کے جذبات بھڑکائے ہیں، نہ غصے کے، نہ نفرت کے، وہ تو آپ کو صرف انسانی دماغ، انسانی کردار اور شخصیت پر ادبی اور تخلیقی انداز سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اگر وہ کوئی جذبہ پیدا کرنے کی فکر میں ہیں۔ تو صرف وہی جذبہ جو ایک فن کار کو جائز طور پہ پیدا کرنا چاہیئے — یعنی زندگی کے متعلق بے پایاں تحیّر اور استعجاب۔ فسادات کے متعلق جتنا بھی لکھا گیا ہے اس میں اگر کوئی چیز انسانی دستاویز کہلانے کی مستحق ہے تو یہ افسانے ہیں۔

چونکہ منٹو کے افسانے سچی ادبی تخلیقات ہیں اس لئے یہ افسانے ہمیں اخلاقی طور پر بھی چونکاتے ہیں، حالانکہ منٹو کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا، بلکہ صرف تخلیق۔ غیر معمولی حالات میں اگر کوئی چیز ہمیں چونکا سکتی ہے تو غیر معمولی واقعات یا افعال نہیں، بلکہ بالکل معمولی اور روزمرّہ کی سی باتیں۔ اگر کوئی دو سو بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کا ہار گلے میں پہن لیتا ہے تو یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ جب قتل ایک عام مشغلہ بن چکا ہو تو اس میں کوئی خوف

کی بات بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ قاتلوں کو یہ فکر ہو رہی ہے کہ خون سے ریل کا ڈبہ گندا ہو جائے گا تو ہم ضرور ایک طرح کی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ قاتلوں کا قتل کئے چلے جانا دہشت انگیز چیز نہیں ہے، دہشت تو اس خیال سے ہوتی ہے کہ جن لوگوں میں صفائی اور گندگی کی تمیز باقی ہے وہ بھی قتل کر سکتے ہیں۔ آخر معنویت تو تقابل اور تضاد ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی حرکتیں ہمیں انسان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتی ہیں کہ حالات انسان کو حیوان کی سطح پر لے آتے ہیں۔ لیکن غیر معمولی حرکتیں کرتے ہوئے معمولی باتوں کی طرف توجہ ہمیں انسان کے متعلق ایک زیادہ گہری اور زیادہ بنیادی بات بتاتی ہے ..... وہ یہ کہ انسان ہر وقت اور بیک وقت انسان بھی ہوتا ہے اور حیوان بھی۔ اس میں خوف کا پہلو یہ ہے۔ کہ انسانیت کے احساس کے باوجود انسان حیوان بننا کیسے گوارا کر لیتا ہے، اور تسکین کا پہلو یہ ہے کہ وحشی سے وحشی بن جانے کے بعد بھی انسان اپنی انسانیت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ منٹو کے ان افسانوں میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں — خوف بھی اور دلاسا بھی۔ ان لطیفوں میں انسان اپنی بنیادی بے چارگیوں، حماقتوں، نفاستوں اور پاکیزگیوں سمیت نظر آتا ہے۔ منٹو کے قہقہے میں بڑا زہر ہے۔ مگر یہ قہقہہ ہمیں تسلی بھی بہت دلاتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں یہ کہنا کہ انسان کی معمولی دلچسپیاں اور معمولی میلانات کسی کے دبائے نہیں دب سکتے۔ بڑی بات ہے، منٹو نے انسان کو نہ ظالم بتایا ہے نہ مظلوم، بلکہ بس اتنا اشارہ کر کے چپ ہو گیا ہے کہ انسان میں بہت سی باتیں بالکل اٹکل بے جوڑ ہیں۔ اس خیال سے مایوسی بھی بہت پیدا ہوتی ہے، مگر ایک طرح سے دیکھئے تو انسانی فطرت

کا یہ انمل بے جوڑ پن ہی حقیقی رجائیت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اگر انسان صرف ایک طرح کا، صرف نیک یا صرف بد ہوتا تو بڑی خطرناک چیز ہوتا۔ انسان کی طرف سے اگر کچھ امید بندھتی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ انسان کا کچھ ٹھیک نہیں اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان اپنی انسانیت کے دائرے میں محبوس ہے، نہ تو فرشتہ بن سکتا ہے نہ شیطان۔ وہ کتنا ہی غیر معمولی کیوں نہ بننا چاہے معمولی زندگی کے تقاضے اسے پھر اپنی حدود میں گھسیٹ لاتے ہیں؛ روزمرہ کی معمولی زندگی ایسی طاقتور چیز ہے کہ انسان اگر بہت اچھا نہیں بن سکتا تو بہت بُرا بھی نہیں بن سکتا۔ معمولی زندگی اُسے ٹھونک پیٹ کے سیدھا کر ہی لیتی ہے۔ منٹو کے ان افسانوں کا سب سے بڑا وصف معمولی زندگی کی قوت اور عظمت کا یہی اعتراف ہے، دوسرے افسانہ نگار ہندوؤں اور مسلمانوں کو شرم دلا دلا کر انہیں راہ راست پہ لانا چاہتے ہیں، لیکن اُن کے افسانے ختم کرنے کے بعد ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا احتجاج کارگر بھی ہو گا یا نہیں، منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پہ لانا چاہتا ہے، وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔ دوسرے لوگ انسان کو ایک خاص رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انسان کو قبول کرنے سے پہلے چند شرائط عائد کرتے ہیں، منٹو کو انسان اپنی اصلی شکل ہی میں قبول ہے، خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ انسان کی انسانیت ایسی سخت جان ہے کہ اس کی بربریت بھی اس انسانیت

کو ختم نہیں کر سکتی، منٹو کو اسی انسانیت پر اعتماد ہے۔

فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں۔ ان میں منٹو کے یہ چھوٹے چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں۔ منٹو کی دہشت اور منٹو کی رجائیت سیاسی لوگوں یا انسانیت کے بیکدل خادموں کی دہشت اور رجائیت نہیں ہے، بلکہ ایک فن کار کی دہشت اور رجائیت، اس کا تعلق بحث و تمحیص یا تفکر سے نہیں ہے بلکہ ٹھوس تخلیقی تجربے سے، یہی منٹو کے ان افسانوں کا واحد امتیاز ہے۔

محمد حسن عسکری

ساعتِ شیریں

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مہاتما گاندھی
کی موت پر اظہارِ مسرت کے لئے امرتسر،
گوالیار اور بمبئی میں کئی جگہ لوگوں میں
شیرینی بانٹی گئی۔

(ا۔پ)

مزدوری

لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ اس گرمی میں اضافہ ہو گیا۔ جب چاروں طرف آگ بھڑکنے لگی۔

ایک آدمی ہارمونیم کی پیٹی اٹھائے خوش خوش گاتا جا رہا تھا "جب تم ہی گئے پردیس لگا کر ٹھیس او پیتم پیارا، دنیا میں کون ہمارا۔"

ایک چھوٹی عمر کا لڑکا جھولی میں پاپڑوں کا انبار ڈالے بھاگا جا رہا تھا۔ ٹھوکر لگی تو پاپڑوں کی ایک گڈی اس کی جھولی میں سے گر پڑی۔ لڑکا اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو ایک آدمی نے جس نے سر پر سلائی کی مشین اٹھائی ہوئی تھی اس سے کہا "رہنے دے بیٹا رہنے دے۔ اپنے آپ بھن جائیں گے۔"

بازار میں دھب سے ایک بھری ہوئی بوری گری۔ ایک شخص نے جلدی سے بڑھ کر اپنے چھرے سے اس کا پیٹ چاک کیا ــــ آنتوں کی بجائے شکر، سفید سفید دانوں والی شکر اُبل کر باہر نکل آئی۔ لوگ جمع ہو گئے اور اپنی جھولیاں

بھرنے لگے۔ ایک آدمی کرتے کے بغیر تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنا تہبند کھولا اور مٹھیاں بھر بھر اس میں ڈالنے لگا۔

"ہٹ جاؤ — ہٹ جاؤ" — ایک تانگہ تازہ تازہ روغن شدہ الماریوں سے لدا ہوا گزر گیا۔

اونچے مکان کی کھڑکی میں سے ململ کا تھان پھڑپھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ شعلے کی زبان نے ہولے سے اسے چاٹا۔۔۔ سڑک تک پہنچا تو راکھ کا ڈھیر تھا۔

"پوں پوں — پوں پوں" — موٹر کے ہارن کی آواز کے ساتھ دو عورتوں کی چیخیں بھی تھیں۔

لوہے کا ایک سیف دس پندرہ آدمیوں نے کھینچ کر باہر نکالا اور لاٹھیوں کی مدد سے اس کو کھولنا شروع کیا۔

"گاؤ اینڈ گیٹ"۔ دودھ کے کئی ٹین دونوں ہاتھوں پہ اٹھائے اپنی ٹھوڑی سے ان کو سہارا دیئے ایک آدمی دکان سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ بازار میں چلنے لگا۔

بلند آواز آئی۔ "آؤ آؤ لیمونیڈ کی بوتلیں پیو — گرمی کا موسم ہے!" گلے میں موٹر کا ٹائر ڈالے ہوئے آدمی نے دو بوتلیں لیں اور شکریہ ادا کئے بغیر چل دیا۔

ایک آواز آئی۔ "کوئی آگ بجھانے والوں کو اطلاع دے دے — سارا مال جل جائے گا" کسی نے اس مفید مشورے کی طرف توجہ نہ دی۔

لوٹ کھسوٹ کا بازار اسی طرح گرم رہا۔ اور اس گرمی میں چاروں طرف بھڑکتے

والی آگ بدستور اضافہ کرتی رہی۔ بہت دیر کے بعد تڑ تڑ تڑ کی آواز آئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔

پولیس کو بازار خالی نظر آیا — لیکن دور، دھوئیں میں ملفوف موڑ کے پاس ایک آدمی کا سایہ دکھائی دیا۔ پولیس کے سپاہی سیٹیاں بجاتے اس کی طرف لپکے — سایہ تیزی سے دھوئیں کے اندر گھس گیا۔ پولیس کے سپاہی بھی اس کے تعاقب میں گئے

دھوئیں کا علاقہ ختم ہوا تو پولیس کے سپاہیوں نے دیکھا کہ ایک کشمیری مزدور پیٹھ پر وزنی بوری اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ سیٹیوں کے گلے خشک ہو گئے مگر وہ کشمیری مزدور نہ رکا۔ اس کی پیٹھ پر وزن تھا۔ معمولی وزن نہیں۔ ایک بھری ہوئی بوری تھی۔ لیکن وہ یوں دوڑ رہا تھا جیسے پیٹھ پر کچھ ہے ہی نہیں۔

سپاہی ہانپنے لگے۔ ایک نے تنگ آکر پستول نکالا اور داغ دیا۔ گولی کشمیری مزدور کی پنڈلی میں لگی۔ بوری اس کی پیٹھ پر سے گر پڑی۔ گھبرا کر اس نے اپنے پیچھے آہستہ آہستہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا۔ پنڈلی سے بہتے ہوئے خون کی طرف بھی اس نے غور کیا۔ لیکن ایک ہی جھٹکے سے بوری اٹھائی اور پیٹھ پر ڈال کر پھر بھاگنے لگا۔

سپاہیوں نے سوچا "جانے دو، جہنم میں جائے"۔

ایک دم لنگڑاتا کشمیری مزدور لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ بوری اس کے اوپر آ رہی۔

سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور بوری سمیت لے گئے۔

راستے میں کشمیری مزدور نے بار ہا کہا۔ "حضرت، آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے ...... میں تو غریب آدمی ہوتی ...... چاول کی ایک بوری لیتی ــــــ گھر میں کھاتی ...... آپ ناحق مجھے گولی مارتی۔"
لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔

تھانے میں بھی کشمیری مزدور نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا۔ "حضرت، دوسرا لوگ بڑا بڑا مال اٹھاتی ...... میں تو فقط ایک چاول کی بوری لیتی ...... حضرت، میں بہت غریب ہوتی۔ ہر روز بھات کھاتی۔"

جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے اپنی میلی ٹوپی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چاولوں کی بوری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر تھانیدار کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "اچھا حضرت، تم بوری اپنے پاس رکھ ــــــ میں اپنی مزدوری مانگتی ــــــ چار آنے!"

تعاون

چالیس پچاس لٹھ بند آدمیوں کا ایک گروہ لوٹ مار کے لئے ایک مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دفعتہ اس بھیڑ کو چیر کر ایک دُبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی باہر نکلا۔ پلٹ کر اس نے بلوائیوں کو لیڈرانہ انداز میں مخاطب کیا: "بھائیو! اس مکان میں بے اندازہ دولت ہے بے شمار قیمتی سامان ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس پر قابض ہو جائیں اور مالِ غنیمت آپس میں بانٹ لیں۔"

ہوا میں کئی لاٹھیاں لہرائیں۔ کئی مکے بھنچے اور بلند بانگ نعروں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔

چالیس پچاس لٹھ بند آدمیوں کا گروہ دُبلے پتلے ادھیڑ عمر کے آدمی کی قیادت میں اس مکان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ جس میں بے اندازہ دولت اور بے شمار قیمتی سامان تھا۔

مکان کے صدر دروازے کے پاس رک کر دُبلا پتلا آدمی بپھر بلوائیوں سے مخاطب ہوا۔ "بھائیو، اس مکان میں جتنا مال بھی ہے سب تمہارا ہے، لیکن دیکھو چھینا جھپٹی نہیں کرنا — آپس میں نہیں لڑنا — آؤ۔"

ایک چلّایا۔ "دروازے میں تالا ہے۔"

دوسرے نے باآواز بلند کہا۔ "توڑ دو!"

"توڑ دو — توڑ توڑ دو۔"

ہوا میں کئی لاٹھیاں لہرائیں، کئی مکے بھنچے اور بلند بانگ نعروں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔

دُبلے پتلے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے دروازہ توڑنے والوں کو روکا اور مسکرا کر کہا۔ "بھائیو ٹھہرو — میں اسے چابی سے کھولتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے تالے میں ڈالی اور اسے کھول دیا شیشم کا بھاری بھرکم دروازہ ایک چیخ کے ساتھ وا ہوا تو ہجوم دیوانہ وار اندر داخل ہونے

کے لئے آگے بڑھا۔ دُبلے پتلے آدمی نے ماتھے کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے کہا: بھائیو، آرام آرام سے جو کچھ اس مکان میں ہے سب تمہارا ہے پھر اس افراتفری کی کیا ضرورت ہے؟

فوراً ہی ہجوم میں ضبط پیدا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے بلوائی مکان کے اندر داخل ہونے لگے۔ لیکن جونہی چیزوں کی لوٹ شروع ہوئی پھر دھاندلی مچ گئی۔ بڑی بے رحمی سے بلوائی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

دُبلے پتلے آدمی نے جب یہ منظر دیکھا تو بڑی دکھ بھری آواز میں لٹیروں سے کہا۔ "بھائیو! آہستہ آہستہ — آپس میں لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نوچ کھسوٹ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ تعاون سے کام لو۔ اگر کسی کے ہاتھ زیادہ قیمتی چیز آگئی ہے تو حاسد مت بنو اتنا بڑا مکان ہے، اپنے لئے کوئی اور چیز ڈھونڈ لو۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وحشی نہ بنو — مار دھاڑ کرو گے تو چیزیں ٹوٹ جائیں گی۔ اس میں نقصان تمہارا ہی ہے۔"

لٹیروں میں ایک بار پھر نظم پیدا ہو گیا۔ بھرا ہوا مکان آہستہ

آہستہ خالی ہونے لگا۔

دُبلا پتلا آدمی وقتاً فوقتاً ہدایت دیتا رہا" دیکھو بھیّا۔ یہ یہ ریڈیو ہے ــــ آرام سے اٹھاؤ، ایسا نہ ہو ٹوٹ جائے ــــ یہ اس کے تار بھی ساتھ لیتے جاؤ۔"

" تہ کر لو بھائی ــــ اسے تہہ کر لو۔ اخروٹ کی لکڑی کی تپائی ہے ــــ ہاتھی دانت کی پچی کاری ہے۔ بڑی نازک ہے ــــ ہاں اب ٹھیک ہے!"

" نہیں نہیں ــــ یہاں مت رہو۔ بھٹک جاؤ گے ــــ اسے گھر لے جاؤ۔"

" ٹھہرو ٹھہرو، مجھے مین سوچ بند کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کرنٹ کا دھکا نہ لگ جائے۔"

اتنے میں ایک کونے سے شور بلند ہوا۔ چار بلوائی ریشمی کپڑے کے ایک تھان پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ دُبلا پتلا آدمی تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور ملامت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔" تم کتنے بے سمجھ ہو۔ چِندی چِندی ہو جائے گی ایسے قیمتی کپڑے کی۔ گھر میں

سب چیزیں موجود ہیں۔ گھر بھی ہوگا۔ تلاش کرو اور باپ کر کپڑا
آپس میں تقسیم کر لو۔"

دفعتاً کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ "عف عف، عف"
اور چشم زدن میں ایک بہت بڑا گدی کتا ایک جست کے ساتھ اندر
لپکا اور لپکتے ہی اس نے دو تین لیٹروں کو جھنجھوڑ دیا۔ دُبلا پتلا
آدمی چلّایا۔ "ٹائیگر۔ ٹائیگر!"

ٹائیگر جس کے خوفناک منہ میں ایک لیٹرے کا نچا ہوا گریبان
تھا۔ دم ہلاتا ہوا دبلے پتلے آدمی کی طرف نگاہیں نیچی کئے قدم
اٹھانے لگا۔

کتے کے آتے ہی سب لیٹرے بھاگ گئے تھے۔ صرف ایک
باقی رہ گیا تھا۔ جس کے گریبان کا ٹکڑا ٹائیگر کے منہ میں تھا۔ اس
نے دُبلے پتلے آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

دُبلا پتلا آدمی مسکرایا، "اس گھر کا مالک — دیکھو دیکھو
تمہارے ہاتھ سے کانچ کا مرتبان گر رہا ہے۔

تقسیم

ایک آدمی نے اپنے لیے لکڑی کا ایک بڑا صندوق منتخب کیا جب اسے اٹھانے لگا تو وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا۔

ایک شخص نے جسے شاید اپنے مطلب کی کوئی چیز مل ہی نہیں رہی تھی۔ صندوق اٹھانے کی کوشش کرنے والے سے کہا۔

"میں تمہاری مدد کروں؟"

صندوق اٹھانے کی کوشش کرنے والا امداد لینے پر راضی ہو گیا۔ اُس شخص نے جسے اپنے مطلب کی کوئی چیز مل نہیں رہی تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے صندوق کو جنبش دی اور اٹھا کر اپنی پیٹھ پر دھر لیا — دوسرے نے سہارا دیا — دونو باہر نکلے۔

صندوق بہت بوجھل تھا۔ اس کے وزن کے نیچے اٹھانے والے کی پیٹھ چٹخ رہی تھی۔ ٹانگیں دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر

انعام کی توقع نے اس جسمانی مشقت کا احساس نیم مردہ کر دیا تھا۔

صندوق اٹھانے والے کے مقابلے میں صندوق کو منتخب کرنے والا بہت ہی کمزور تھا۔ سارا رستہ وہ صرف ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اپنا حق قائم رکھتا رہا۔ جب دونو محفوظ مقام پہ پہنچ گئے تو صندوق کو ایک طرف رکھ کر ساری مشقت برداشت کرنے والے نے کہا۔ "بولو۔ اس صندوق کے مال میں سے مجھے کتنا ملے گا۔"

صندوق پر پہلی نظر ڈالنے والے جوابدیا۔" ایک چوتھائی۔"

"بہت کم ہے۔"

"کم بالکل نہیں زیادہ ہے — اس لئے کہ سب سے پہلے میں نے ہی اس پہ ہاتھ ڈالا تھا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن یہاں تک اس کمر توڑ بوجھ کو اٹھا کے لایا کون ہے؟"

"آدھے پر راضی ہو؟"

"ٹھیک ہے — کھولو صندوق۔"

صندوق کھولا گیا تو اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔

ہاتھ میں تلوار تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دونوں حصہ داروں
کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔

جائز استعمال

دس راؤنڈ چلانے اور تین آدمیوں کو زخمی کرنے کے بعد پٹھان بھی آخر سرخ رُو ہو ہی گیا۔

ایک افرا تفری مچی تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ مار دھاڑ بھی جاری تھی۔ پٹھان اپنی بندوق لئے گھسا اور تقریباً ایک گھنٹہ کشتی لڑنے کے بعد تھرموس بوتل پہ ہاتھ صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پولیس پہنچی تو سب بھاگے — پٹھان بھی۔

ایک گولی اس کے داہنے کان کو چاٹتی ہوئی نکل گئی پٹھان نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور سُرخ رنگ کی تھرموس بوتل کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھا۔

اپنے دوستوں کے پاس پہنچ کر اس نے سب کو بڑے فخریہ انداز میں تھرموس بوتل دکھائی۔ ایک نے مسکرا کر کہا — "خان صاحب آپ یہ کیا اٹھا لائے ہیں؟"

خان صاحب نے پسندیدہ نظروں سے بوتل کے چمکتے ہوئے ڈھکنے کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیوں؟"

"یہ تو ٹھنڈی چیزیں ٹھنڈی اور گرم چیزیں گرم رکھنے والی بوتل ہے۔"

خان صاحب نے بوتل اپنی جیب میں رکھ لی۔ "خوام اس میں نسوار ڈالے گا — گرمیوں میں گرم رہے گی۔ سردیوں میں سرد!"

بے خبری کا فائدہ

ببلبی دبی — پستول سے جھنجھلا کر گولی باہر نکلی۔

کھڑکی میں سے باہر جھانکنے والا آدمی اسی جگہ دوہرا ہو گیا۔

ببلبی تھوڑی دیر کے بعد پھر دبی — دوسری گولی بھنبھناتی ہوئی باہر نکلی۔

سڑک پر ماشکی کی مشک پھٹی۔ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو مشک کے پانی میں حل ہو کر بہنے لگا۔

ببلبی تیسری بار دبی — نشانہ چوک گیا۔ گولی ایک گیلی دیوار میں جذب ہو گئی۔

چوتھی گولی ایک بوڑھی عورت کی پیٹھ میں لگی — وہ چیخ بھی نہ سکی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔

پانچویں اور چھٹی گولی بیکار گئی۔ کوئی ہلاک ہوا نہ زخمی۔
گولیاں چلانے والا بھنّا گیا۔ دفعتہً سڑک پر ایک چھوٹا سا
بچّہ دوڑتا دکھائی دیا۔ گولیاں چلانے والے نے پستول کا منہ
اس طرف موڑا۔

اس کے ساتھی نے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہو؟"
گولیاں چلانے والے نے پوچھا۔ "کیوں؟"
"گولیاں تو ختم ہو چکی ہیں۔"
"تم خاموش رہو ۔۔۔ اتنے سے بچّے کو کیا معلوم؟"

مناسب کارروائی

جب حملہ ہوا تو محلے میں سے اقلیت کے کچھ آدمی تو قتل ہو گئے۔ جو باقی تھے جانیں بچا کر بھاگ نکلے۔ ایک آدمی اور اس کی بیوی البتہ اپنے گھر کے تہہ خانے میں چھپ گئے۔

دو دن اور دو راتیں پناہ یافتہ میاں بیوی نے قاتلوں کی متوقع آمد میں گزار دیں۔ مگر کوئی نہ آیا۔

دو دن اور گزر گئے۔ موت کا ڈر کم ہونے لگا۔ بھوک اور پیاس نے زیادہ ستانا شروع کیا۔

چار دن اور بیت گئے میاں بیوی کو زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہ رہی ۔ دونوں جائے پناہ سے باہر نکل آئے۔

خاوند نے بڑی نحیف آواز میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا

اور کہا "ہم دونوں اپنا آپ تمہارے حوالے کرتے ہیں — ہمیں مار ڈالو۔"

جن کو متوجہ کیا گیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ "ہمارے دھرم میں تو جی ہتیا پاپ ہے۔"

وہ سب جینی تھے۔ لیکن انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور میاں بیوی کو مناسب کارروائی کے لئے دوسرے محلے کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔

کرامات

لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لئے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کئے۔

لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے اپنا مال بھی موقعہ پاکر اپنے سے علیحدہ کر دیا تاکہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔

ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں جو اس نے پنساری کی دکان سے لوٹی تھیں۔ ایک تو وہ جوں کی توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنوئیں میں پھینک آیا۔ لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔

شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے کنوئیں میں رسیاں ڈالی

گئیں۔ دو جوان نیچے اترے اور اس آدمی کو باہر نکال لیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔

دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لئے اس کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔

اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔

اصلاح

"کون ہو تم؟"

"تم کون ہو؟"

"ہر ہر مہادیو — ہر ہر مہادیو۔"

"ہر ہر مہادیو۔"

"ثبوت کیا ہے؟"

"ثبوت — میرا نام دھرم چند ہے۔"

"یہ کوئی ثبوت نہیں۔"

"چار ویدوں میں سے کوئی بھی بات مجھ سے پوچھ لو۔"

"ہم ویدوں کو نہیں جانتے — ثبوت دو۔"

"کیا؟"

"پائجامہ ڈھیلا کرو۔"

پائجامہ ڈھیلا ہوا تو ایک شور مچ گیا۔ "مار ڈالو۔ مار ڈالو"
"ٹھہرو ٹھہرو — میں تمہارا بھائی ہوں — بھگوان کی
قسم تمہارا بھائی ہوں۔"

"تو یہ کیا سلسلہ ہے ؟"

"جس علاقے سے آرہا ہوں وہ ہمارے دشمنوں کا تھا۔
اس لئے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف اپنی جان بچانے
کے لئے۔ ۔ ۔ ۔ ایک یہی چیز غلط ہو گئی ہے۔ باقی بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اڑا دو غلطی کو۔"

غلطی اڑا دی گئی — دھرم چند بھی ساتھ ہی اڑ گیا۔

جیلی

صبح چھ بجے پٹرول پمپ کے پاس ہاتھ گاڑی میں برف بیچنے والے کے چھرا گھونپا گیا ۔ سات بجے تک اس کی لاش لُک بچھی سڑک پر پڑی رہی اور اس پر برف پانی بن بن گرتی رہی ۔

سوا سات بجے پولیس لاش اٹھا کر لے گئی ۔ برف اور خون وہیں سڑک پر پڑے رہے ۔

ایک ٹانگہ پاس سے گزرا ۔ بچے نے سڑک پر جیتے جیتے خون کے جمے ہوئے چمکیلے لوتھڑے کی طرف دیکھا ۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ اپنی ماں کا بازو کھینچ کر بچے نے انگلی سے اس طرف اشارہ کیا ۔ " دیکھو ممی جیلی ؟ "

دعوتِ عمل

آگ لگی تو سارا محلہ جل گیا — صرف ایک دکان بچ گئی
جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا —

"یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے"

پٹھانستان

"خو، ایک دم جلدی بولو، تم کون اے؟"

"میں ... میں ..."

"خو شیطان کا بچہ جلدی بولو — اِندو اے یا مسلمین؟"

"مسلمین"

"خو تمہارا رسول کون ہے؟"

"محمد خان"

"ٹھیک اے — جاؤ"۔

خبردار

بلوائی مالکِ مکان کو بڑی مشکلوں
سے گھسیٹ کر باہر لے آئے، کپڑے
جھاڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بلوائیوں
سے کہنے لگا، "تم مجھے مار ڈالو لیکن
خبردار جو میرے روپے پیسے کو ہاتھ
لگایا!"

ہمیشہ کی چھٹی

"پکڑلو۔ پکڑلو۔ دیکھو جانے نہ پائے"
شکار تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد
پکڑ لیا گیا۔ جب تیر اس کے آر پار
ہونے کے لئے آگے بڑھے تو اس نے لرزاں
آواز میں گڑگڑا کر کہا۔ "مجھے نہ مارو۔ مجھے
نہ مارو۔ میں تعطیلوں میں اپنے گھر جا
رہا ہوں۔"

حلال اور جھٹکا

"میں نے اس کی شہ رگ پر چھری رکھی - ہولے ہولے پھیری اور اس کو حلال کر دیا"

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیوں؟"

"اس کو حلال کیوں کیا"؟

مزہ آتا ہے اس طرح"

"مزا آتا ہے کے بچے"، تجھے جھٹکا کرنا چاہیئے تھا - اس طرح"

اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا -

گھاٹے کا سودا

دو دوستوں نے مل کر دس بیس لڑکیوں میں سے ایک لڑکی چنی اور بیالیس روپے ـــــ دے کر اُسے خرید لیا۔ رات گزار کر ایک دوست نے اس لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے"

لڑکی نے اپنا نام بتایا تو وہ بھنّا گیا۔" ہم سے تو کہا گیا تھا کہ تم دوسرے مذہب کی ہو"

لڑکی نے جواب دیا۔ " اس نے جھوٹ بولا تھا"

یہ سن کر وہ دوڑا دوڑا اپنے دوست کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔

" اس حرامزادے نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ہمارے ہی مذہب کی لڑکی تھما دی ـــــ چلو واپس کر آئیں"

حیوانیت

بڑی مشکل سے میاں بیوی گھر کا تھوڑا اثاثہ بچاتے ہیں کامیاب ہوئے۔ جوان لڑکی تھی۔ اس کا کوئی پتہ نہ چلا چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کو ماں نے اپنے سینے کے ساتھ چمٹائے رکھا۔ ایک بھوری بھینس تھی اس کو بلوائی ہانک کر لے گئے۔ گائے بچ گئی مگر بچھڑا نہ ملا۔

میاں بیوی، ان کی چھوٹی لڑکی اور گائے ایک جگہ چھپے ہوئے تھے۔ سخت اندھیری رات تھی۔ بچی نے ڈر کے رونا شروع کیا تو خاموش فضا میں جیسے کوئی ڈھول پیٹنے لگا۔ ماں نے خوفزدہ ہو کر بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہ دشمن سن نہ لے۔ آواز دب گئی۔ باپ نے احتیاطاً اوپر گاڑھے کی موٹی چادر ڈال دی۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے کسی بچھڑے کی آواز آئی۔

کھاد

اس کی خودکشی پر اس کے ایک دوست نے کہا۔
بہت ہی بے وقوف تھا جی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو
اگر تمہارے کیس کاٹ دیئے ہیں اور تمہاری داڑھی مونڈ دی ہے
تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا دھرم ختم ہو گیا ہے — روز
دہی استعمال کرو۔ واہگورو جی نے چاہا تو ایک ہی برس میں تم پھر
ویسے کے ویسے ہو جاؤ گے۔"

گلّو کے کان کھڑے ہوئے۔ اُٹھی اور ادھر اُدھر دیوانہ وار دوڑتی ڈکرانے لگی۔ اس کو چپ کرانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بے سود۔

شور سن کر دشمن آ پہنچا۔ دور سے مشعلوں کی روشنی دکھائی دی۔ بیوی نے اپنے میاں سے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔

"تم کیوں اس حیوان کو اپنے ساتھ لے آئے تھے"

کسرِ نفسی

چلتی گاڑی روک لی گئی۔ جو دوسرے مذہب کے تھے ان کو نکال نکال کر تلواروں اور گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر گاڑی کے باقی مسافروں کی حلوے، دودھ اور پھلوں سے تواضع کی گئی۔ گاڑی چلنے سے پہلے تواضع کرنے والوں کے منتظم نے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا۔ "بھائیو اور بہنو! ہمیں گاڑی کی آمد کی اطلاع بہت دیر میں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس طرح چاہتے تھے، اس طرح آپ کی خدمت نہ کر سکے۔"

استقلال

"میں سکھ بننے کے
لئے ہرگز تیار نہیں۔
—— میرا استرا
واپس کر دو مجھے!"

نگرانی میں

ا اپنے دوست ب کو اپنا ہم مذہب ظاہر کر کے اُسے مقام پر پہنچانے کے لئے ملٹری کے ایک دستے کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں ب نے جس کا مذہب مصلحتاً بدل دیا گیا تھا۔ ملٹری والوں سے پوچھا۔ "کیوں جناب آس پاس کوئی واردات تو نہیں؟"

جواب ملا۔ "کوئی خاص نہیں — فلاں محلے میں البتہ ایک کتا مارا گیا۔"

سہم کر ب نے پوچھا۔ "کوئی اور خبر"۔

جواب ملا۔ "خاص نہیں — نہر میں تین کتیوں کی لاشیں ملیں۔"

ا نے ب کی خاطر ملٹری والوں سے کہا۔ "ملٹری کچھ انتظام نہیں کرتی"۔

جواب ملا۔ "کیوں نہیں — سب کام اسی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔"

جُوتا

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے منہ پر تارکول مل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کئے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر پولیس آگئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔

جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لیے اسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

پیش بندی

پہلی واردات ناکے کے ہوٹل کے پاس ہوئی۔ فوراً ہی وہاں ایک سپاہی کا پہرہ لگا دیا گیا۔

دوسری واردات دوسرے ہی روز شام کو اسٹور کے سامنے ہوئی۔ سپاہی کو پہلی جگہ سے ہٹا کر دوسری واردات کے مقام پر متعین کر دیا گیا۔

تیسرا کیس رات کے بارہ بجے لانڈری کے پاس ہوا۔

جب انسپکٹر نے سپاہی کو اس نئی جگہ پہرہ دینے کا حکم دیا تو اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے وہاں کھڑا کیجئے جہاں نئی واردات ہونے والی ہے۔"

سوری

چھری پیٹ چاک کرتی
ہوئی ناف کے نیچے
تک چلی گئی ۔ آزار بند
کٹ گیا ۔ چھری مارنے
والے کے منہ سے دفعتہً
کلمۂ تاسف نکلا ۔
"چ، چ، چ، چ"
مشٹیک ہو گیا ۔"

رعایت

"میری آنکھوں کے سامنے میری جوان
بیٹی کو نہ مارو"
"چلو اسی کی مان لو — کپڑے اتار کر
ہانک دو ایک طرف"

صفائی پسندی

گاڑی رُکی ہوئی تھی۔

تین بندوقچی ایک ڈبے کے پاس آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا "کیوں جناب کوئی مرغا ہے؟"

ایک مسافر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ باقیوں نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد چار نیزہ بردار آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا "کیوں جناب کوئی مرغا ورغا ہے؟"

اس مسافر نے جو پہلے کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا جواب دیا۔ "جی معلوم نہیں ــــ آپ اندر آ کے سنڈاس میں دیکھ لیجیے۔"

نیزہ بردار اندر داخل ہوئے۔ سنڈاس توڑا گیا۔ تو اس میں سے ایک مرغا نکل آیا۔

ایک نیزہ بردار نے کہا۔ "کردو حلال"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں یہاں نہیں۔ یہ خراب ہو جائے گا ــــ باہر لے چلو۔"

صدقے اُس کے

مجرا ختم ہوا۔ تماشائی رخصت ہو گئے۔ تو استاد جی نے کہا۔ سب کچھ لٹا پٹا کر یہاں آئے تھے۔ لیکن اللہ میاں نے چند دنوں ہی میں وارے نیارے کر دیئے۔"

اشتراکیّت

وہ اپنے گھر کا تمام ضروری سامان ایک ٹرک میں لدوا کر دوسرے شہر جا رہا تھا۔ کہ راستے میں لوگوں نے اُسے روک لیا۔ ایک نے ٹرک کے مال و اسباب پر حریصانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا، "دیکھو یار کس مزے سے اتنا مال اکیلا اڑائے چلا جا رہا تھا"۔

اسباب کے مالک نے مسکرا کر کہا، "جناب یہ مال میرا اپنا ہے"

دو تین آدمی ہنسے۔ "ہم سب جانتے ہیں"

ایک آدمی چلّایا۔ "لوٹ لو، یہ امیر آدمی ہے — ٹرک لے کر چوریاں کرتا ہے"

اُلٹا

"دیکھو یار۔ تم نے بلیک مارکٹ
کے دام بھی لئے اور ایسا ردی
پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی
نہ جلی۔"

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں — دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"
"رہنے دو یار — میں تھک گیا ہوں۔"

قسمت

"کچھ نہیں دوست
اتنی محنت —————
کرنے پر صرف ایک
بکس ہاتھ لگا تھا پر
اس میں بھی سالا
سوٗر کا گوشت نکلا"۔

آنکھوں پہ چربی

"ہماری قوم کے لوگ بھی کیسے ہیں—
پچاس سؤر اتنی مشکلوں کے بعد تلاش کر کے
اس مسجد میں کاٹے ہیں۔ وہاں مندروں میں
دھڑا دھڑ گائے کا گوشت بک رہا ہے۔
لیکن یہاں سؤر کا مانس خریدنے کے لئے
کوئی آتا ہی نہیں۔"

۷۸۶

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے
اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری
کے سارے اسرار و رموز دفن
ہیں ۔۔۔ وہ اب بھی منوں مٹی
کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ
نگار ہے یا خدا

سعادت حسن منٹو

---

۱۸ اگست ۱۹۵۴ء